بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

جدید مغربی فلسفۂ جرم و سزا کا نشوونما ایک خاص نظریاتی فریم میں ہوا ہے۔

اس کی بنیادوں میں اوّلین تصوّر یہ کام کر رہا ہے کہ بے خدا مادی کائنات میں انسان کی پیدائش حیوانات کے خاندان میں چند اتفاقات کی ہم آہنگی سے ہوئی ہے۔ وہ نہ کسی صاحبِ ارادہ و حکمت خالق کی مخلوق ہے، نہ وہ ایک روحانی و اخلاقی وجود ہے جس پر خلافت کی ذمہ داریاں عاید ہوں، اور نہ وہ اپنے اعمال و افعال میں کسی بالاتر قوت کے سامنے جوابدہ ہے۔

جس تصوّرِ تاریخ میں انسان کو رکھ کر دیکھا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ انسان پہلے قبل تاریخ کے دورِ تاریکی میں تھا۔ اور جنگلی جانوروں کی سی زندگی سے اُس نے اپنے دور کا آغاز کیا[1] پھر مل جل کر رہنے کی وجہ سے اس میں مدنیت کا جب آغاز ہوا تو اُس نے کچھ ایسی تکلیف دہ اور ناخوشگوار

---

[1] ہمارا تصوّرِ تاریخ بالکل مختلف ہے۔ دُنیا کا پہلا انسان خدائی ہدایت ساتھ لے کر آیا۔ پھر جب جب یہ ہدایت ضائع ہوئی یا دھندلا گئی یا مسخ ہو گئی تو بعد میں بار بار انبیاء اس کی تجدید کے لیے مبعوث ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ یہ سلسلہ نبی آخرالزماںؐ تک پہنچا۔ یعنی ہمارا نقطۂ نظر یہ ہے کہ "انسانی زندگی کا آغاز اخلاقی شعور اور الٰہی ضابطۂ ہدایت یا دوسرے لفظوں میں اسلام کے ساتھ ہوا۔ بعد کی ساری تاریخ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کی تاریخ ہے۔ وحشت اور غلاظت اور تاریکی کا تعلق جاہلیت سے ہے۔ خواہ یہ جاہلیت کتنی ہی عالمانہ اور عقلی ہو اور جدید ہو۔

چیزوں کو جرم قرار دے لیا جسے مجموعی طور پر کسی مدنی یونٹ کے سارے شر کا روکنا چاہتے تھے۔ ایسے جرائم کے لیے اپنے نیم مدنی، نیم وحشیانہ دور کے مطابق بہت ہی غیر شائستہ قسم کی سزائیں مقرر کیں۔ جیسی کہ بعض دور افتادہ علاقوں کے تہذیب نا آشنا قبائل میں آج بھی پائی جاتی ہیں۔ اس دور کے سلسلۂ جرم و سزا پر بالعموم مذہب یا دیوتاؤں کا لیبل لگادیا گیا۔ اور آبا پرستی کے تحت اُن میں ایسا تقدس پیدا کر لیا گیا کہ عقلی طور پر اس معاملے میں غور و فکر سے کام لینے کی کسی میں مجال ہی نہ تھی۔ اب جو روشن دورِ عقل اہل مغرب کی قیادت میں نمودار ہوا ہے اس نے ازسرِنو جرم و سزا کے نظریات کو عقلی طور پر مدون کر کے قانون کو شائستگی کی سطح تک پہنچا دیا ہے۔

جُرم کی تشخیص اور سزا کی تعیین میں دورِ جدید کے جمہوری نظام نے شارع کا مرتبہ اُصولاً عوام کو اور عملاً نمائندہ ایوانوں کی حکمران اکثریتی پارٹیوں کو دے دیا ہے۔ کوئی جرم، جرم ہے یا نہیں، ہے تو کس درجے کا ہے، جس بھی درجے کا ہے اس کے مطابق کیا سزا دی جانی چاہیے، اس کا فیصلہ رائے عام کے مطابق حکمران پارٹی جمہوری ایوان میں کرتی ہے۔ نئے دور کی یہ شارع قوت جب چاہے کسی جرم کو کارِ خیر قرار دے، جب چاہے کسی سزا کو ناروا ٹھہرا دے۔

یورپ میں یوں تو ایسی بے شمار تبدیلیاں ہوئی ہیں۔ مگر چند نمایاں مثالیں قابلِ توجہ ہیں۔ زنا بالرضا کو دورِ نو کی عقلیت نے جائز ٹھہرایا۔ اور اب کوئی مرد ایک سے زیادہ شادیاں کرے تو وہ تو جرم ہے، لیکن اگر وہ بغیر کسی جبر کے دسیوں عورتوں کی آبرو سے کھیلتا رہے تو یہ حلال طیب ہے۔ بلوغت کی مقررہ عمر سے قبل شادی کرنا قانوناً ممنوع ہے، لیکن شادی کیے بغیر شادی والے تعلقات کا ذوّاقین اور ذوّاقات میں قائم ہوتے رہنا مباح ہے۔ ایک دردناک مثال یہ ہے کہ عملِ قومِ سدوم جو مغرب میں بھی شروع سے ممنوع چلا آرہا تھا، اب اکثر مہذب ترین ممالک میں جائز تعلق قرار دیا گیا ہے، بلکہ علانیہ ایک ہی جنس کے زوجین باقاعدہ یکجائی ازدواجی زندگی کا آغاز کرتے ہیں اور شادی کا ڈراما بھی رچاتے ہیں۔ ایسا ہی سزاؤں کے معاملے میں ہوا ہے۔ کچھ لیڈروں اور پروپیگنڈے کے اداروں اور انتخاب جیتنے کے لیے سیاسی پارٹیوں نے یہ نقطۂ نظر پھیلانا شروع کیا کہ کسی مجرم (خواہ وہ قتل کر چکا ہو) کو سزائے موت دینا ایک وحشیانہ حرکت ہے، لہٰذا اسے قانوناً ختم ہو جانا چاہیے۔ چنانچہ برطانیہ، امریکہ اور بعض دوسرے "مہذب" معاشروں میں سزائے موت ختم کر دی گئی ہے۔ لیکن اس کا نتیجہ اعداد و شمار

کے مطابق قتل اور دوسرے سنگین جرائم میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا ہے - چنانچہ ایک بار پھر آواز اٹھ رہی ہے کہ سزائے موت کو بحال کر دینا چاہیے - اور تو اور، امریکہ کے نئے صدر ریگن صاحب نے بھی سینے میں گولی کھانے اور قبر کے کنارے سے لوٹنے کے بعد بیان دیا ہے کہ سزائے موت ضروری ہے -

جدید فلسفۂ جرم و سزا کا جو خاص عطیہ یہ ہے کہ جرم کا نشانہ بننے والوں کی مصیبتوں سے قطع نظر کر کے مجرم کے لیے ہمدردی کے جذبات کار فرما ہو گئے ہیں - مغربی فلسفی، مصنفین، مقننین، سیاسی اکابر اور جج اور وکلاء سب کے سب اپنے دلائل اور جذبات کا وزن مجرم کے پلڑے میں ڈالتے ہیں - دورِ جدید کے علم "مجرمانہ انسانی فعلیات" (CRIMINAL ANTHROPOLOGY) میں سب سے پہلے نمایاں طور پر ہمدردیٔ مجرم کا عنصر ایک شخص (LOMBROSO) نے داخل کیا -

---

انسان کے حیوانی تصوّر پر مبنی اس مادہ پرستانہ اور جمہوری تصوّرِ جرم و سزا کی جڑیں ایسے بیشتر ذہنوں میں اُتری ہوئی ہیں ___ شاید ان کا پورا شعور بھی اُن کو نہ ہو ___ جو متعدد اسلامی ممالک میں قانون کی ڈگریاں حاصل کر کے عدالت و وکالت کی ذمہ داریاں اُٹھائے ہوتے ہیں - اور اُن کی پشت پر ماڈرن ازم کے قتیلانِ ناز کا جدید تعلیم یافتہ طبقہ دُور دُور تک پھیلا ہوا ہے - اس طبقے کے اذہان اگر قدرے محبِ اسلام بھی ہوں تو بھی وہ جب جرم و سزا کے مسائل پر سوچتے ہیں تو "شائستگی" کے خلافِ اسلام تصوّر کو کسوٹی بنا کر اس پر قرآن و سنّت کی سزاؤں کو پرکھتے ہیں - اور جو چیز اس تصوّرِ شائستگی کے خلاف نظر آئے اُسے دین سے خارج رکھنا چاہتے ہیں - بعض ایسے شائستگی پرست اصحاب نے قرآن میں جب چوری کی سزا قطع ید دیکھی تو لغت اور محاورے اور سنّت اور معمولِ اُمّت سب کو بالائے طاق رکھ کر حکم لگا دیا کہ قطع ید سے یہاں مراد چور کے ہاتھوں کو چوری کرنے سے روک دینا ہے - آپ نے اسے جیل میں ڈال دیا تو قطع ید ہو گیا - یا آپ نے توبہ کرا کے اس کے معاشی مسئلے کو حل کرنے کے لیے وظیفہ مقرر کر دیا تو بھی قطع ید ہو گیا - قرآن کی زبان اتنی عامیانہ اور سطحی کیسے ہو سکتی ہے کہ وہ قطعِ ید کہے تو اُس کے معنی کسی آلے سے چور کا ہاتھ کاٹ دینا ہوں - پھر قرآن سے ایسی ناشائستگی کی توقع نہیں لگائی جا سکتی - اس عنصر کا کہنا یہ ہے کہ

حضورؐ کے جو اقوال و افعال قطع ید کے سیدھے سادے غیر پُراسرار مفہوم کی تائید کرتے ہیں وہ حضورؐ جیسے حکیم اور شفیق انسان کے اقوال و افعال ہو ہی نہیں سکتے۔ ایسی چیزیں تو عجمی سازش کے تحت گھڑ گھڑ کر لوگوں نے دفتر جمع کر دیے۔ تاریخ اگر ایسی گواہی دیتی ہے تو قرآن کے مقابلے میں تاریخ کی کیا حیثیت ہے جب کہ قرآن اپنے آپ کو واضح کرنے کے لیے کسی خارجی امداد کا محتاج نہیں[1]۔ قرآن میں استعمال شدہ الفاظ "قطع ید" کے صحیح معنی وہ ہیں جو ہم نے بتائے ہیں اور یہ حق ہر دَور کے لوگوں بلکہ ہر شخص کو پہنچتا ہے کہ وہ قرآنی الفاظ و عبارات کا مفہوم متعین کرے۔ اگر خدا کے رسولؐ نے اُن کا کوئی مفہوم متعین کیا بھی تھا تو وہ اسی خاص دَور کے لیے تھا۔ ہم سے کیا مطلب؟ اُس دَور کے لوگ رسولؐ کی تفسیر و تشریح کے محتاج ہوں گے۔ ہم ضرورت مند نہیں ہیں۔ ہم تو اپنی مرضی سے اجتہاد کریں گے۔ یہی چیز سزائے رجم کو شریعت سے خارج قرار دینے کی بھی محرک بنی۔

دیکھیے ذہنوں کے اندر اُترے ہوئے مغربی تصوراتِ جرم و سزا اور معیاراتِ شائستگی معاملے کو کہاں سے کہاں لے گئے۔

میں چونکہ اس وقت مسئلے کو عقلِ عام کی روشنی میں لانا چاہتا ہوں، اس وجہ سے پہلے میں جُرم کی شناعت کے چند پہلو واضح کرنا چاہتا ہوں۔

کسی خاتون کی عصمت جب لوٹی جاتی ہے تو اُس کے لیے بے شمار اثرات ہوتے ہیں:۔

۱- ایسا حادثہ اُس کی نسائی خودی کا قاتل ہوتا ہے۔ اُس کی حیا تباہ ہو جاتی ہے، جو گناہ اور بُرائی روکنے والی مؤثر داخلی قوت ہے۔

۲- اگر وہ کنواری ہو تو اُس کا ازدواجی مستقبل تباہ ہو سکتا ہے اور اُس کے ماں باپ اور بہن بھائی ذلّت کا نشانہ بن سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُس کے بہن بھائیوں کے لیے بھی رشتے بند ہو جائیں اور اُن میں سے جو شادی شدہ ہوں وہ سسرالی گھرانوں میں بے وقعت ہو جائیں۔ اس کی کسی بہن کو

---

[1] غالباً لغت اور گرامر کی قید سے بھی قرآن کو آزاد رکھنا چاہیے۔

اس کا ہونے والی گھر سے نکال بھی سکتا ہے۔ کم سے کم ساری عمر طعنوں کا سلسلہ تو اُسے جراحتیں لگاتا رہے گا۔

۳۔ خاندان یا محلے میں ایسے حادثے کا چرچا یا معاشرے میں اُس کا شہرہ خود مظلومہ کے لیے تکلیف دہ ہونے کے علاوہ کئی دوسرے غیر سلیم الفطرت نوجوانوں میں بدکاری کے مجرمانہ رجحانات پیدا کر سکتا ہے۔

۴۔ اگر وہ شادی شدہ ہو تو اُس کا شوہر اُسے طلاق بھی دے سکتا ہے۔ اُسے معلّقہ بنا کے بھی رکھ سکتا ہے یا اُسے مستقلاً نشانۂ طعن و تشنیع بنا سکتا ہے۔

۵۔ اگر اُس کے بچے ہوں تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اپنی ماں کے ساتھ گزرے ہوئے کسی حادثے کی وجہ سے وہ بھی بُرائی کے تصورات کی لذت لیتے لیتے خود بھی جرم کی راہ پر پڑ جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ دوسروں کے طعنے سنیں یا اپنے ہی اندر کے احساسِ کمتری کا شکار ہو جائیں۔ ہو سکتا ہے کہ اُن میں معاشرے کے خلاف انتقامی جذبہ پیدا ہو جائے اور وہ آہستہ آہستہ خوفناک مجرم بن جائیں۔

۶۔ مغرب کے جدید غیر اسلامی تصورات کے مطابق جو لوگ زنا بالرضا کو کچھ مختلف نوعیت دیتے ہیں وہ اگر سوچیں تو انھیں اندازہ ہوگا کہ اُوپر بیان کردہ بیشتر خرابیوں کا ظہور اس صورت میں بھی ہو سکتا ہے بلکہ مخالفتِ ضمیر، خیانتِ شوہر اور بد لحاظیٔ اولاد کے پہلو بھی شامل ہو جاتے ہیں۔

۷۔ مرد کے لیے بھی زنا اُس کے ذہن و ضمیر کو بگاڑنے، اچھے خاندانوں سے حصولِ رشتہ کا دروازہ بند کرنے، اس کے ازدواجی حالات کو خراب کرنے، والدین اور بہن بھائیوں اور خاندان کے حلقوں میں اُسے ذلیل بنانے اور معاشرے کے لیے اُسے ذریعۂ اشاعتِ فحش بنانے کے لحاظ سے بہت بڑے اثراتِ بد رکھتا ہے۔

۸۔ یہ ایسا جرم ہے کہ اس کے نتیجے میں بسا اوقات خودکشی کے حادثات بھی ہوتے ہیں اور ان حادثات سے مزید بُرے سماجی اثرات نمودار ہوتے ہیں۔

ایسا فعلِ شنیع جس کے نتائج اگر متعلقہ افراد، خصوصاً عورت کو زیادہ ملتے ہیں، مگر ان کا دائرہ بہت وسیع ہوتا ہے، اس پر کیا اور کیسی سزا ہونی چاہیے، یہ اس جرم کے متاثرین سے پوچھیے۔ بلکہ میں ذرا سی گستاخی کر کے یہ کہوں گا کہ عبرت مند لوگ چاہے اسی خیال کے ہوں یا اسی طرزِ فکر کے (خدانہ کرے کہ کسی کو ایسی آزمائش پیش آئے) اگر کسی کی ماں بہن، بیوی یا بیٹی

کے خلاف ایسا کوئی حادثہ ہو جائے تو یہ کسی متعلقہ شخص کو دیوانہ بنا سکتا ہے، اور پھر اگر اُس کے جذبات قانون کے فیصلے کا انتظار نہ کریں تو بس چلنے کی صورت میں وہ جو سزا دے گا اس کا اندازہ ہر کوئی کر سکتا ہے۔ قانونی سزا کے غیر متناسب ہونے کا ردّ عمل بھی خطرناک شکل اختیار کر سکتا ہے

ہمارے معاشرے میں جہاں اس جرم کی مثالیں عام ہیں، وہاں بحالتِ اشتعال اس جرم کی خوفناک سزائیں دینے کی مثالیں بھی بکثرت ہیں۔ بحالتِ اشتعال کیا۔ بہت سے لوگ تو مدتِ دراز کے بعد تیاری کر کے بدلے لیتے ہیں اور بسا اوقات انتقام در انتقام کا چکر چلتا ہے۔ اور انگریزی قانون جو یہاں اس سلسلے میں رائج رہا ہے۔ وہ اِس جرم کی زد میں آنے والی خواتین اور خاندانوں کو اطمینان و اعتماد نہیں دلا سکا اور نہ معاشرے نے کبھی اسے انصاف سمجھا ہے۔ میرے ان جملوں کا مقصد یہ ہرگز نہیں کہ شہریوں کو قانون ہاتھ میں لینا چاہیے۔ بلکہ میرا مدعا یہ واضح کرنا ہے کہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لینے والے لوگ عام طور پر اپنے فطری داعیات کے تحت ایسے جرم پر موت کی سزا دیتے ہیں۔ ایسے واقعات بھی اخبارات میں آتے رہے ہیں کہ انتقام لینے والوں نے محض کسی کو مار دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے اعضا کاٹے ہیں اور بوٹیاں الگ کر دی ہیں۔

ایسی مثالیں ایشیاء اور افریقہ ہی میں نہیں، معضو ڈری بہت یورپی ممالک میں بھی ملتی ہیں، جہاں انسانی فطرت کو ملحدانہ علوم اور پروپیگنڈے کے ذریعے مسخ کر دیا گیا ہے۔

انسانی معاشروں کے ان حالات کو سامنے رکھیں تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ رجم ہی اس جرمِ شنیع پر کم سے کم انتہائی درجے کی معقول سزا ہے جس میں جان لینے کے علاوہ مجرم کو نشانۂ بیزاری بھی بنایا جاتا ہے۔ اس سے کم تر سزا دینے سے ایک طرف جرم کو فروغ ہوگا، دوسری طرف جرم کی لپیٹ میں آنے والے فرد اور اُس کے اعزہ و اقربا کے شدید ردّ عمل کی آگ .... بجھ نہ سکے گی نیز جرم و سزا میں تناسب نہ ہونے کی وجہ سے متاثرین اور عام معاشرے میں انصاف کا حق ادا ہونے کا احساس نہیں ہوگا[1]

---

[1] دَورِ حاضر کے لیے بنتھم نے جو افادی نظریۂ قانون سازی مرتب کیا ہے اُس کے (باقی بر صفحہ آئندہ)

آپ یہ سوال اُٹھا سکتے ہیں کہ ہماری گفتگو کا زیادہ تر رُخ مجرم مرد کی طرف رہا ہے، مجرم عورت کی طرف نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں بالعموم اغوا کرنے والا مرد ہوتا ہے اور عورت اس کے جال میں پھنستی ہے۔ ناموس پر حملہ کرنے والا مرد ہوتا ہے۔ عورت اس طرح حملہ آور نہیں ہوتی۔ پس کثیر صورتوں میں عورت بے گناہ ہو سکتی ہے۔ اور سارا جرم مرد کے حصے میں جاتا ہے۔ لیکن "بالرضا" والی صورت میں (بسبب کہ عورت کو اکراہ یا خوف یا کسی اسکینڈل کے ڈراوے یا فریب یا بیہوشی یا اور کسی پیچیدہ صورت میں مبتلا نہ کیا گیا ہو) عورت بھی برابر کی مجرم ہوگی اور برابر کی سزا پائے گی۔

دوسرا سوال آپ یہ کر سکتے ہیں کہ آخر شادی شدہ اور غیر شادی شدہ مرد و عورت کی سزاؤں میں فرق کیوں ہے؟

یہاں اختلافِ احوال کے لحاظ سے مجرم کو اس کی مجبوری یا کمزوری کا الاؤنس دیا جاتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں مجرم سے جائز طور پر جو ہمدردی کی جا سکتی ہے یا رعایت برتی جا سکتی ہے، شریعت اُسے ملحوظ رکھتی ہے۔ مثلاً عورت کے متعلق سہ گونہ مدارجِ حد یہ ہیں:-

ا- شادی شدہ فتیات (غیر آزاد اور غیر خاندانی عورتیں) = ۵۰ کوڑے

ب- غیر شادی شدہ محصنات (آزاد خاندانی عورتیں) = ۱۰۰ کوڑے

ج- شادی شدہ آزاد خاندانی عورتیں = رجم (سزائے موت بشمول تذلیل)

پہلی صورت میں مجرمہ کو ایک کمتر درجہ صورتِ احصان حاصل ہے، لہٰذا سزا بالکل کم (نمبر ۲ سے آدھی) دوسری صورت میں چونکہ خاندانی عورت کو خاندان کی وجہ سے خاص مضبوط صورت (باقی بر صفحہ ۴۲)

(بقیہ حاشیہ صفحہ سابقہ) رُو سے جرم کرنے والے کو جُرم کے فائدے یا لذّت کے ساتھ سزا سے بچ نکلنے کا جو امکان نظر آتا ہے۔ اس کے بالمقابل اگر جُرم کی نوعیت کے مطابق قانون دوسرے پلڑے میں مناسب درجے کی سخت سزا نہ رکھے تو اس صورت میں جرم بڑھے گا اور مجرم جری ہوں گے اور ایسے ہی وجوہ ہیں کہ مغرب کا نظریہ جُرم و سزا، جرائم میں کمی کے بجائے اضافے کا باعث بن گیا ہے اور کسی نظامِ تہذیب کے تحت جرائم کا بڑھنا (دوسرے حالات سے قطع نظر) اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ نظریۂ جرم و سزا کی ساخت درست نہیں ہے۔